

علامہ اقبال اور زوال و عروج ملت اسلامیہ

ڈاکٹر محمد ریاض

”علامہ اقبال ان اکابر و مفکرین اسلام میں سے ہیں جن کا تفکر فرد اور ملت دونوں سے مربوط ہے۔ اس تفکر کو اقبال نے خودی اور بیخودی کا نام دیا ہے۔ وہ فرد کی خودی کو ملت کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے قائل تھے :

وجود افراد کا مجازی ہے، بہتسی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زینِ طلسم مجاز ہو جا۔^(۱)

اقبال نے اہم گذشتہ و حال کے زوال و عروج کے اسباب و علل پر غائر نظر ڈالی اور ملت اسلامیہ کے نشیب و فراز پر فطرتاً وہ زیادہ متوجہ رہے۔ مفکرین اسلام میں سے کئی نے یہ کام ماضی و حال میں انجام دیا کہ زوال و عروج ملت اسلامیہ کے اسباب و نتائج معلوم کریں مگر علامہ اقبال کا سا غیر مادی اور روحانی نقطہ نظر دوسروں کے ہاں بالعموم مفقود نظر آتا ہے۔ اقبال مادی وسائل اور ظاہری اسباب کے منکر نہیں مگر انہیں روحانی اور ایمانی امور کے تابع قرار دیتے ہیں۔ ان کا تصور ملت بھی کتب سیاسیات کے تصور ملت سے مختلف ہے۔ وہ حکومتی اقتدار کو ہی عروج نہ جانتے تھے۔ علمی اور معنوی عروج اس سے کہیں اہم تر ہے مگر دور زوال کے مسلمان ان دونوں قسم کی برتریوں سے محروم ہو گئے تھے :

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
 ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
 حکومت کا تو کیا روٹا کہ وہ اک عارضی شے تھی
 نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چسارا
 مگر وہ علم کے موتی کت میں اپنے آباہ کی
 جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے پیپارا^(۲)

قرآن مجید میں فرد کی ہی نہیں، ملت کی مدتِ حیات معین بتائی گئی ہے۔ اسی اصول کے تحت اقوام و ملل بجز وجود سے ابھرا بھر کے بنتی رہی ہیں۔ علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کا عالمگیر زوال و انحطاط ملاحظہ کرنے کے باوجود پُر امید تھے کہ اس ملت کا حال کتنا ہی مایوس کن بھی، اس کے مستقبل کے ادوار اس کے ماضی کی طرح شاندار اور پر عروج ہوں گے:

ہم نشیں مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں
 نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے اور مسلم کے تخیل میں جبارت اس سے ہے
 حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
 قسمتِ عالم کا مسلم کو کب تا بندہ ہے جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے
 آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات کہہ نہیں سکتے مجھے نوید پیر کاہ حیات
 کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
 یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار^(۳)

۱۰ یہاں اقبال نے یہ نکتہ بتایا ہے کہ امتِ مسلمہ خالص توحید کی حفاظت کے لئے ہمیشہ موجود ہے

گی۔ اگر دنیا کے ایک گوشے میں اسے زوال آ گیا تو دیگر گوشوں میں اسے عروج ملے گا کہ :

جہاں میں اہل ایساں صورتِ خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے ادھر نکلا، ادھر ڈوبے ادھر نکلا^(۴)

مثنوی رموزِ بخودی میں اقبال فرماتے ہیں کہ امتِ مسلمہ قرآن مجید کی حامل ہے اور چونکہ اس کتابِ اعظم کی اہلی حفاظت کا وعدہ خود خدا نے تعالیٰ نے کر رکھا ہے، لہذا اس کتاب کے حامل دنیا سے مٹ نہیں سکتے :

فردِ رمیٰ نیز از مشیتِ گلے	قوم زاید از دلِ صاحبِ دلے
فردِ پورِ شصت و ہفتاد است و بس	قوم را صد سالِ مثلِ یکِ نفس
زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن	زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگ فرد از خشکیِ رودِ حیات	مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات
گر چہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد	از اجلِ فرمانِ پذیرد مثلِ فرد ^(۵)
امتِ مسلم ز آیاتِ خداست	اصلش از ہنگامہٗ قالوا بلی، ست ^(۶)
از اجلِ این قوم بے پروا ستے	استوار از سخنِ سخنِ نزلنا، ستے ^(۷)
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است	از دوامِ او دوامِ ذاکر است
تا خدا، ان یطفوا فرمودہ است ^(۸)	از فرودنِ این چراغِ آسودہ است

یعنی فردِ مشیتِ خاک سے وجود میں آتا ہے مگر ملت کو ایک صاحبِ دل، تخلیق کرتا ہے۔ فرد کی حیات ۶۰ یا ۷۰ سال ہے مگر قوم کے لئے ۱۰۰ سال ایک سانس سے زیادہ نہیں فرجِ م و روح کے تعلق سے عبارت ہے مگر قوم ناموسِ قدیم کی حفاظت سے زندہ رہتی ہے۔ فرد طبعی عمر کو پہنچ کر مر جاتا ہے مگر قوم اپنے مقصدِ حیات کو ترک کرنے سے نابلود رہ جاتی ہے۔ قوم کے لئے بھی گو فرد کی طرح مدتِ حیات معین ہے مگر اسلامی ملتِ حُر جوازل سے آیتِ الہی

رہی، اس قاعدہ کلی سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ قرآن مجید کی حامل ہے جس کی حفاظت موعود من اللہ ہے۔ خدا نے چونکہ قرآن حکیم کی ابدی حفاظت کا وعدہ فرمادیا، لہذا ملت اسلامیہ بھی بہر طور ابدی رہے گی۔

مندرجہ بالا اشعار میں دو نکتے بالخصوص تامل تو یہ ہیں۔ ایک یہ کہ مقصدِ حیات سے غافل قوم صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ کوئی صاحبِ دل شخص قوم کو وجود میں لاتا ہے اقبال نے جاوید نامہ میں یہی فرمایا ہے کہ انبیاء و رسل کی ایک شناخت یہ ہے کہ وہ صالح اقوام کو وجود میں لے آتے ہیں :

گفت اقوام و ملل آیاتِ اوست مصر بائے ما ز مخلوقاتِ اوست
رحمتِ حقِ صحبتِ احرارِ او قہرِ بزدانِ ضربتِ کرارِ او
گرچہ باشی عقل کل از دوسے مرم زانکہ او بیند تن و جان را بہم
صاحبِ دل اور درد مند شخص کی بے قدری بھی قوم کو زوال اور انحطاط سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ اقبال نے رومی کا یہ معروف شعر تائید کے لئے نقل کیا ہے :

تا دل صاحبِ دلے نامد ببرد بیجِ قومے را خدا رسوا کند (۹)
خطرِ حیات سے غافل قوم کا ٹٹنا کسی توجیہ و تفسیر کا محتاج نہیں۔ اس ضمن میں بھی اقبال نے شنیوی رومی کا مندرجہ ذیل شعر دوبار تفسیر کیا ہے: (۱۰)

ہر ہلاکِ امتِ پیشین کہ بود زانکہ بر حندل گمان بردند عود
یعنی ہر امتِ گزشتہ کی تباہی اس لئے ہوئی کہ اس کے افراد پتھر کو عود (خوشبودار لکڑی) سمجھنے لگے تھے۔ ان تمہیدی اشارات سے واضح ہو جاتا ہے کہ عروج و زوال اہم نکتہ اقبال کے نہایت اہم امور میں سے ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک عروجِ ملت اسلامیہ کے اسباب کیا تھے

اور زوال کے کیا اور دوبارہ احیائے مسلمین کے لئے وہ کیا تجاویز رکھتے تھے۔

عروج و ترقی کا شاندار دور

اس دور کے بارے میں دیگر زعمائے ملت کی طرح، اقبال کا تبصرہ یہ ہے کہ جذبہ ایمان کی پختگی عقائد کے قال کے بجائے حال بننے اور اتحاد و ایمانِ کامل نے مسلمانوں کو باہم عروج پر پہنچا دیا تھا وہ قرآن و سنت کے متمسک تھے اس لئے خدا نے تعالیٰ نے اپنے وعدے کے بموجب انہیں ہر قوم کے توفیق و کامرانی سے نوازا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی ہرگز ترقی کا ضمن ان کا دین تھا۔ یہی دین جس نے بقول اقبال ^(۱۱) ہر مشکل وقت میں مسلمانوں کی مدد کی ہے۔ یہ حساب ہنگامہ و انقلابِ دین ہے :

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب دین بندہ مومن کے لئے موت ہے یا خواب
اسے وادیِ لولاب ^(۱۲)

یہاں اسلام کے شاندار ماضی کی ساری فتوحات اور کامرانیوں گنوائی نہیں جاسکتیں البتہ اشعارِ اقبال کے ذریعے مسلمانوں کے دورِ عروج اور عصرِ زوال کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے :

کون ہے تارکِ آئین رسولِ مختار	مصلحتِ وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سما ہے شعائرِ عیار	ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں	کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں
ہر کوئی مستِ نئے ذوقِ تن آسانی ہے	تم مسلمان ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدر علی فقر ہے، نئے دولتِ عثمانی ہے	تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر	اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

خودکشی خیونہ تمہارا وہ غیور و خوددار
 تم ہو گھٹا رسراپا، وہ سراپا کردار
 اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
 عقل ہے تیری پر عشق ہے شمشیر تری
 ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
 کی محمد سے و ناتونے تو ہم تیرے ہیں
 تم اُخت سے گریزاں، وہ اُخت پزناں
 تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکناں
 نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی
 مرے درویش، خلافت ہے جہانگیر تری
 تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
 یہ جہاں پیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسباب زوال

جواب شکوہ کے مندرجہ بالا بند بعض اسباب زوال کے متضمن ہیں جیسے غیر مسلموں کی تقلید، ترک قرآن، تفرق و بے نظمی اور حضرت رسول اکرمؐ کے ساتھ محبت کا فقدان۔ یہ سارے اسباب دراصل ترک قرآن کے سبب فاعد میں مجتمع ہیں۔ اقبال اس لئے فرماتے ہیں کہ تا کہین قرآن سے کسی نیر و خوبی کی توقع نہیں۔ ان میں مستی و سرور آسکتا ہے نہ وہ ذوق طلب سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں :

آنکہ بود اللہ اور اساز و برگ
 رفت از وہ آں مستی و ذوق و سرور
 سینہ ہا از گرمی قرآن تہی
 ہر کے بر جادہ خود تنس درو
 فتنہ اور سب مال و ترس مرگ
 دین او اندر کتاب و او بگور
 از چینیں مردان سپہ امید بہی؟
 ناقہ ما بے زمام و ہرزہ دو
 العجب . ثم العجب ، ثم العجب ^(۱۳)

امت مسلمہ کی معاصرانہ پیمانہ گی، غلامی، علمی اور معاشرتی تقلید اور معاشی بے پرو سامانی پر اقبال نے بہت لکھا ہے مگر اسباب زوال میں وہ نظام طو کیت، مذہبی پیشوائیت ،

عدم اتحاد اور سود خواری وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جاوید نامہ میں ہے :

از ملکیت جہان تو خراب تیرہ شب در آستین آفتاب

دانش افرنگیاں غارت گری دیر با خیمہ شد از بے حیدری

آنکہ گوید لاله بیچارہ ایست فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست

چار مرگ اندر پے ایں دیر میر سود خوار و والی و ملا و پیر

مسلمانوں کی فکری بے مرکزی اور ان کا افتراق تو حید و رسالت کے تقاضے پیش نظر نہ

رکھنے سے ہوا ہے اقبال کے نزدیک عقائد وحدت انکار کے علاوہ وحدت اعمال کے بھی مظہر ہونے

ضروری ہیں^{۱۴}۔ لہذا ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک حرم کو ماننے والوں کا افتراق و

پراگندگی افسوسناک اور باعث ننگ ہے :

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرق بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانے میں پٹننے کی یہی باتیں ہیں ؟

سود خواری نے مسلمانوں کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ مذہبی پیشوائیت صوفیہ اور ملاؤں کی

صورت میں مشہور رہی ہے۔ دور انحطاط کے صوفی و ملا نے اس انحطاط میں اضافہ ہی کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنا زندگی کے آخری عشرے کی تصانیف میں اس گروہ پر گہرے انتقادات

لکھے ہیں مثلاً :

صوفی کی طریقت میں نقطہ مستی احوال ملا کی شریعت میں نقطہ مستی گفتار

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں نقطہ مستی کردار

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں بہانے عملی کا نبی شراب الست

فقیر شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے میں شریعت کے جگ دست بدست
گریز کشکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟^(۱۵)
ملوکیت و آمریت صرف نظامِ شاہی کا نام نہیں۔ ہر استبداد اور استحصال کا طریقہ
ملوکیت کی ہی ایک قسم ہے :

کاروبارِ خہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میر و سلطان پر نہیں ہے منحصر
جلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ جو جس کی نظر^(۱۶)
اقبال نے اس موضوع پر نظم اور نثر دونوں میں کافی لکھا ہے کہ اسلام میں نظامِ ملوکیت کی
کوئی گنجائش نہیں۔^(۱۷) ملوک و سلاطین نے اسلامی ثقافت و مدنیت کو بے حد نقصان پہنچایا اور
غیر قرآنی نظامِ زندگی کو متداول کرتے رہے ہیں :

دین او نقش از ملوکیت گرفت	تا نہالِ سلطنت قوت گرفت
عقل و ہوش و رسم و رہ گوردگر	از ملوکیت نگہ گوردگر
سینہ بے نور او از دل تہماست	ہم ملوکیت بدن را قہر ہی است
بوگ را بگزارد و شہدش برد	مثل زنبورے کہ بر گل می چسرد
بر جالش تالہ بلبس ہمان	شاخ و بوگ و رنگ و بوئے او همان
ترک صورت گوئے و در معنی نگر	از طلسم رنگ و بوئے او گدرد
گلِ نخوان او را کہ در معنی گل است	مرگ باطن گر چہ دیدن مشکل است

(جاوید نامہ)

دیگر اسباب

تن آسانی و کاہلی، اجتماعی ذمہ داری سے نگرانی اور غلط تصویرِ تقدیرہ سرگاتہ دیگر اسباب

زوال ہیں جنہیں اقبال بار بار یاد دلاتے رہے ہیں۔ سخت کوشش اقوام بھی کچھ عرصہ بعد تن آسان و کاہل بن جاتی ہیں اور اس طرح ان کی باطنی قوت ٹوٹنے لگتی ہے۔ اقبال عثمانی اور ہندی (مغل تیموریوں) کا مثال دیتے ہیں۔ پہلے گروہ میں اب بھی جانِ حیات ہے مگر دوسرا گروہ حمیت اور سخت کوشش سے محروم ہو گیا ہے :

مگر یہ رازِ آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے^(۱۸)
درفش ملت عثمانیاں دوبارہ بلند
چو گوہریت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد است^(۱۹)
کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری
میں تجھ کو تاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے؟
شمشیر و سنان اول، طاؤس و ربابِ آخر^(۲۰)
اقبال فرماتے ہیں کہ تقدیراتِ ازلی افراد کے گناہوں کو معاف کر دیتی ہیں مگر اقوام و ملل کی
تفسیریں ناقابلِ معافی ہیں۔ لہذا قومی و ملی فیصلے سمجھ کر کرنے چاہئیں :

نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خواہ زمانے میں کبھی جو ہر ذاتی
شاید کوئی عمل ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی
ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخِ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ قوموں کے عمل پر نظر اس کی
بڑاں صفت تیغِ دوپیکر نظر اس کی
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کہ نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرتِ افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف^(۲۱)
تقدیر کے تصور کے بارے میں بحثیں بے حد و حساب ہیں۔ اقبال کو اس بات سے اتفاق ہے

کہ انسان جزواً آزاد ہے اور جزواً مجبور و پابند :

چو گویم از چگون و بے چگونش
بروں مجبور و مختار اندرونش

چنیس فرمودہ سلطانِ بدرِ راست کہ ایمان در میان جبر و قدر است^{۳۲}
 مگر ان کے نزدیک اطاعتِ خداوندی کے ذریعے مجبوری، مختاری میں بدلتی رہتی ہے اور
 تقدیروں کی تجدید ہوتی رہتی ہے جس طرح قوم کے بدلنے سے اس کی تقدیر بدل جاتی ہے، اسی
 طرح ہر فرد بھی اپنی سرنوشت بدل سکتا اور اسے بہتر بنا سکتا ہے۔ پیامِ مشرق کے دیباچے میں
 حضرت علامہ نے لکھا ہے !

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام
 مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے
 اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خداجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ
 اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اہل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ
 لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بافسہم^{۳۳} کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی
 کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔

اقبال اسی مناسبت سے جاوید نامہ میں فرماتے ہیں کہ اتالی نفوس کے بدلنے سے ان کی تقدیریں
 بدل جاتی ہیں۔ خدائے فیاض کے ہاں تقدیروں کی کمی نہیں وہ برناتے تقاضا تقدیریں بدل دیتا ہے
 اقبال شبلی نعمانی کی طرح صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے استشہاد کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مجبور
 جان کر ہاتھ پاؤں توڑ کر کیوں نہ بیٹھ گئے؟ حضرت، خالد بن ولید کی جنگوں پر ایک نظر ڈالو کہ انہوں نے
 کبھی شکست نہ کھائی !

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست
 شبہی؟ افتدگی تقدیر تست قلزمی؟ پانندگی تقدیر تست
 نوع دیگر بین جہان دیگر شود این زمین دآسماں دیگر شود

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ لرزد از نیروئے او ابلیس و مرگ
 جبر خدائے علی بر ہم زند جبر مایخ و بن ما بر کند
 کار مردان است تسلیم و رضا بر ضعیفان راست ناید این قبا
 مرد مومن با خدا دارد نیاز با تو ما سازیم ، تو با ما ساز
 عزم او خلاق تقدیر حق است روز، ہیجا تیر او تیر حق است
 (جاوید نامہ)

اقبال قناعت اور توکل کے غلط معانی اور تقدیر پرستی کو مسلمانوں کے دوزخ والوں سے

مروط بناتے ہیں :

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم جس نے مومن کو بتایا مہ و پروین کا امیر
 تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
 تھا جو تا خوب ، بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
 (ضرب کلیم)

علاج زوال

احیائے اسلام و مسلمین کی خاطر سیاسی تحریکوں اور مادی وسائل کی فراہمی کی اہمیت مسلم ہے اور مصوٰر پاکستان علامہ اقبال خود بھی ۱۹۰۹ء سے نامرگ کوئی ۲۰ سال تک برصغیر یا عالم اسلام وغیرہ کے حوالے سے اس سلسلے میں رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ مگر ان کے نزدیک علاج زوال کا نسخہ مادی ہی نہیں، معنوی بھی ہے :

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکم دل کی علاج اس کا وہی آب نشاط انگیزے ساتی
 اقبال فرماتے ہیں کہ دعویٰ ایمان کے باوجود موجودہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کے ساتھ تجدید

عہد و پیمان کی ضرورت ہے الا ما شاء اللہ:

رمز سوز آموز از پر داند
در شرر آباد کن کاشانہ
طرح عشق انداز جان خویش
تازہ کن با مصطفیٰ پیمان خویش
زانکہ تو محبوب یار ماستی
ہمچو دل اندر کنار ماستی^(۲۵)

اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان متحد ہوں، اسلام کے ساتھ عملاً متمک ہوں، غیروں کی ریشہ دوانیوں پر نظر رکھ کر چوکنا ہوں اور امید و یقین کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں گزند نہیں پہنچا سکتی:

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دین میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تاجخاک کا تنفر
جو کرے گا امتیاز رنگ و بو مٹ جائے گا
ترکِ خرقا ہی ہو یا اسرائیلی والا گھر^(۲۶)

فریاد زافرنگ و دلاویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمارِ حرم، باز بہ تعمیر جہان نیز
از خواب گراں، خواب گراں، از خواب گراں نیز
از خواب گراں نیز^(۲۷)

دین ہو فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
حرف اس قوم کا ہے سوزِ عمل زار و زبول
ہوتے ہیں بختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
ہو گیا بختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر^(۲۸)
جب اس انکارِ خلی میں توتلے بغیر پیدا
تو کرتا ہے یہ بال و پیر روح الامین پیدا

یعین افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے
 غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمیری نہ تدبیری جو ہو ذوق یقین پیدا، تو کٹ جاتی ہیں زنجیری
 یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں، یہ مردوں کی شمیری^(۲۹)
 عروجِ ملت کے لئے اقبال نے جو شعر کردار، جدتِ فکر و عمل اور حرکی نظامِ تعلیم و تفریح کے
 سے کئی نئے تجویز کئے ہیں مگر اہم ترین بات دینِ اسلام کو تہمت پہنچانے کی ہے۔ اس کا عمل دین نے
 زندگی کی جملہ شئون کو مرتب اور منظم صورت میں محیط کر رکھا ہے۔ اگر کوئی نام نہاد مسلمان
 قومِ اسلام سے روگرداں ہو، تو جلد یا بدیر اس کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اقوام کے تغیر و تبدل
 کا کام اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اصول کے طور پر نافذ رہا ہے۔^(۳۰) اقبال تارکِ قرآن مسلمانوں کے مستقبل
 سے مایوس ہیں۔ وہ انہیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہیں اور خدا کے اجتماعی تعزیراتی قوانین بھی
 جاوید نامہ اور دارمغانِ حجاز کے چند اشعار پر ان اشارات کو ختم کیا جاتا ہے :

بندہ مومن ز قسآن بر نخورد دریا یخ او نہ مے دیدم نہ درد
 ملے می خواہد این دنیاے پیر آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر
 مغل ما بے مے و بے ساقی است ساز قسآن را فواہا باقی است
 زخمہ ما بے اثر افتد اگر آسمان دارد ہزاران زخمہ و
 ذکر حق از امتان آمد غنی از زمان و از مکان آمد غنی
 حق اگر از پیش ما بردار دوش پیش قومے دیگرے بگذار دوش
 مسلمان فاقہ مست و زندہ پوش است نہ کاش جس جبرئیل اندر خروش است
 بیافش دگر ملت بریزیم کہ این ملت جہان را بار دوش است
 دگر ملت کہ کارے پیش گیرد دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد

نگردد بایکے عالمِ رضا مند دو عالم را بدوشِ خویش گیرد
 دگر قوسے کہ ذکر لا الہش بر آرد از دل شبِ صبحِ گاہش
 شناسد منزلش را آفتابے کہ ریگ کہکشان مُوید ز راہش
 آزاد ترجمہ :

نام نہاد مسلمانوں نے قرآن مجید سے استفادہ نہ کیا۔ ان کے پیالے میں شراب دیکھی جا سکتی ہے نہ تلچھٹ۔ اس بڑے عالم کو اب ایسی ملت کی ضرورت ہے جو شیر بھی ہو اور تیز بھی ہم مسلمانوں کی محفل سے وساتی سے محروم ہے البتہ سازِ قرآن کو ابدی صدائیں موجود ہیں اس مقدس ساز کے لئے ہمارا زغم کام نہ کرے تو فلک کے پاس دیگر مضراب بجانے والے موجود ہیں۔ کتابِ خدا قوموں کی محتاج ہے نہ زمان و مکان کی۔ خدا اس کتابِ عظیم کو ہمارے درمیان سے اٹھائے تو اسے کسی دوسری قوم کو دے دے گا (جو اس کے شایانِ شان ہو).....

مسلمان خاقوں پہ قانع اور چھٹے پرانے کپڑوں پر خوش ہے مگر اس کے کرتوتوں پر حضرت جبرئیلؑ بھی فریاد کن ہیں۔ آئیے ایک دوسری امت، عالم وجود میں لے آئیں کہ موجودہ ملتِ اسلامیہ تو عالم کے لئے بار دوشِ نبی ہوئی ہے۔ نئی امت ایسی ہو جو کچھ دکھائے اور خوب بد میں امتیاز کر سکے۔ وہ ایسی ملت ہو جو ایک نہیں دو دو جہانوں کی ذمہ داری قبول کر سکے ایسی ملت اسلامیہ جو ذکرِ توحید سے تاریکیِ شب کو نورِ صبح میں بدل سکے۔ اس ملتِ اسلامیہ کی تابانیاں نیز عالمِ تاب کی روشنی پر غالب آجائیں گی۔

حوالہ جات

۱۔ بانگِ در احصہ دوم، پیامِ عشق ۔

- ۲- ایضاً حصہ سوم، خطاب بہ جوانانِ اسلام
- ۳- ایضاً، مسلم
- ۴- ایضاً طلوعِ اسلام
- ۵- اشارہ بہ قرآن مجید آیہ ۲۴۰، سورہ ۷
- ۶- ایضاً ۱۷۲: ۷
- ۷- ایضاً ۹: ۱۵
- ۸- ایضاً ۳۲: ۸
- ۹- بال جبریل، نظم پیر و مرید
- ۱۰- ایضاً اور پیامِ مشرق، پیشکش
- ۱۱- دیکھیں ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے خطبہ اللہ آباد کا آخری حصہ
- ۱۲- ملا زادہ ضیفم لولابی کشمیری کا بیاض (غدا) اور مغان حجاز
- ۱۳- جاوید نامہ، سخنے بانثراد نو
- ۱۴- دیکھیں قطعہ توحید (ضربِ کلیم)
- ۱۵- ضربِ کلیم - قطعاتِ مستی کردار اور شکست، بالترتیب -
- ۱۶- نظم ابلیس کی مجلسِ شورائی، اور مغان حجاز
- ۱۷- دیکھیں احمدیوں اور قادیانیوں کے سلسلے میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے مضمون کا جواب اقبالؒ
- ۱۸- بانگِ درا، نظم غلام قادر روہیلہ
- ۱۹- مثنوی مسافر
- ۲۰- بال جبریل

- ۲۱- ضربِ کلیم
- ۲۲- ذیلِ برعمجم، گلشنِ راز جدید جواب سوال ۸
- ۲۳- قرآن مجید ۱۳ : ۱۱
- ۲۴- دیکمیں میری کتاب برکات، اقبال میں مقالہ اقبال اور شبلی مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۸۳ء
- صفحہ ۲۳۸
- ۲۵- شتوی روزِ خودی پیشکش
- ۲۶- بانگِ درا، حضورِ راہ
- ۲۷- ذیلِ برعمجم
- ۲۸- ضربِ کلیم
- ۲۹- بانگِ درا، طلوعِ اسلام
- ۳۰- قرآن مجید ۲۰ : ۱۴
-